حالی لاہور میں

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

Abstract:

This paper reveals the story of Hali when he was in Lahore for a couple of years during the second half of the 19th century. In this period Lahore emerged as the cultural and literary hub of India. Hali was deeply inspired by the new wave of western literature. This creative impact brought a revolutionary change in his literary concepts. It was Lahore where he formulated his views about the new in his poetry and later on he constructed the new theory of criticism. Lahore was the main spring of all these changes.

حضرت مجدد الف ثانی نے ایک مقام پر فرمایا ہے کہ لاہور تمام شہروں کا قطب الارشاد ہے جو خیال یہاں سے شروع ہوتا ہے وہ پورے ہندوستان میں پھیل جاتا ہے۔ ارشاد حضرتِ مجدد کا ہے اور ان کا ارشاد باطل کیسے ہو سکتا ہے۔ جو بات مجھے کہنی ہے اس کا تعلق اردو ادب سے ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک اردو ادب نے لاہور شہر میں جو منازل طے کی ہیں وہ حضرت مجدد کے ارشاد کے عین مطابق نظر آتی ہیں۔ ۱۸۷۴ء میں لاہور جدید اردو شاعری کا قطب الارشاد قرار پایا اور اب تک یہ شہر اس ارشاد کی توقیر نبھائے چلا جا رہا ہے۔ بات صرف جدید اردو شاعری کی نہیں ہے بات تو اردو ادب کی ہے۔ میرے محترم دوست شمیم حنفی نے میرے سامنے کئی بار ذاتی مجلسوں اور علمی مجالس میں یہ کہا ہے کہ پچھلے ڈیڑھ سو برس سے لاہور شہر نے اردو ادب کو نکیل ڈالی ہوئی ہے یہ جس طرف چاہتا ہے اسے لیے پھرتا ہے۔ پہلی بات تو حضرتِ مجدد کی تھی اور دوسری بات اردو تنقید کے ایک مجدد کی ہے جو دلی شہر کی نواحی بستی ذاکر باغ میں رہتا ہے اور آج کل ایک جان لیوا بیماری کے خلاف مدافعتی جنگ کر رہا ہے میں اس کی مکمل صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔

آپ حیران ہوں گے کہ میں نے اپنے مقالے کا عنوان تو ''حالی لاہور میں'' بتایا تھا اور میں باتیں مجدد صاحب کی کر رہا ہوں بھلا اس میں کیا منطق اور کیا ربط ہے؟ جناب والا اس میں ربط بھی ہے اور منطق بھی۔ بیان آگے بڑھے گا تو بات واضح ہوتی جائے گی۔

لاہور میں حالی کا قیام انیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے ابتدائی برسوں میں رہا۔ اپچی سن کالج کے معلم کی حیثیت سے وہ کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں اور پنجاب بک ڈپو کے ملازم کے طور پر ان کا قیام اندرونِ شہر کے ایک بالاخانہ میں رہا، جہاں سے ہر روز وہ پرانے شہر کی گلیوں، بازاروں سے گزرتے ہوئے نئی نارکلی میں داخل ہوتے، گھوڑوں اور تانگوں کے شہر میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ انارکلی کے آخر تک پہنچ جاتے تھے۔ پھر بائیبل سوسائٹی سے ذرا پہلے دائیں ہاتھ مڑتے، مڑتے ہی سامنے محکمہ تعلیم کی عمارت اس جگہ پر تھی جہاں لاہور کے جلیل القدر صوفی حضرت میاں میر قادری کی خانقاہ تھی جہاں وہ اپنے اوراد اور وظائف میں مصروف رہتے تھے اور اپنے عقیدت مندوں کے لیے فیوض و برکات کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ اسی مقام پر ان کی رحلت ہوئی تھی۔ حالی ہولے ہولے اپنے دفتر کے کمرے میں داخل ہو جاتے تھے جہاں ان کا سامنے ترجموں سے ہوتا اور ساتھ ساتھ وہ نصابی کتب یا ترجمہ شدہ مضامین میں اصلاح کا کام کرتے رہتے تھے۔

میرے خیال میں یہ جگہ حالی کے لیے تجربہ گاہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی ادبی تجربہ گاہ کی ایک نشست پر مسلسل کام کرتے ہوئے ان پر یہ منکشف ہوا تھا کہ فارسی ادب اور انگریزی ادب کی وقعت و اہمیت اس جدید دور میں کیا ہے۔ یہ اسی کشف کا نتیجہ تھا کہ ان کے ذہن میں فارسی ادبیات کی وقعت کم ہوتی چلی گئی اور انگریزی ادبیات سے ان کی ذہنی مناسبت بڑھتی چلی گئی۔ اسی مناسبت کا نتیجہ بالآخر مقدمہ شعروشاعری کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ پنجاب بک بورڈ لاہور کے زمانے ہی میں ان کے ادبی مستقبل کا ابتدائی منظرنامہ اپنی شکل وصورت بنانے میں مصروف ہو گیا تھا۔

حالی کے عہد کا لاہور تیزی کے ساتھ مغلیہ شہر سے کلونیل شہر میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اگرچہ لاہور کی آبادی کی اکثریت اب بھی اندرونِ شہر رہتی تھی۔ جہاں پر زندگی سلطانی دور سے مغلیہ دور تک آہستہ روی سے چلتی رہی تھی۔ ماضی کے داستانی ماحول میں ڈوبا ہوا شہر اس وقت بھی کسی داستان کا شہر معلوم ہوتا تھا۔ صبح ہوتی تو شہر پناہ کے دروازوں سے لوگ باہر نکلتے اور باہر سے آنے والے تجارتی قافلے، مسافر، سیاح اور طالب علم شہر میں داخل ہوتے۔ سورج کے بلند ہونے کے ساتھ ساتھ شہر میں رونق عروج پر پہنچ جاتی۔ مدارس میں علما اور طلبہ جمع ہوتے۔ خانقاہوں میں صوفیا کے اذکار ہوتے۔ دن بھر سرگرمیاں جاری رہتیں۔ اخبارات اور رسائل شائع ہوتے۔ پورے ہندوستان کو نصابی کتب مہیا کرنے کے لے یہاں کے چھاپہ خانے شب و روز حرکت میں رہتے۔ مغلیہ دور میں قلمی نسخوں اور مصوری کے نمونوں کی خرید وفروخت کا مرکز مسجد وزیر خاں تھا اور اسی پس منظر میں مطبوعہ کتب کا مرکز کشمیری بازار بن گیا تھا۔

کلونیل لاہور حالی کے دور میں بڑی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ حالی نے لاہور کی مال (The Mall) دیکھی

تھی جو ہندوستان بھر میں 'ٹھنڈی سڑک' کے نام سے مشہور تھی۔ یہی وہی سڑک ہے جو لوئر مال سے میاں میر گاؤں تک کلکتہ حکومت کی خصوصی گرانٹ سے تعمیر کی گئی تھی۔ لاہور کا انگریز لیفٹیننٹ گورنر اور چیف انجینئر ہاتھ میں فیتہ تھامے ہوئے اس کا معائنہ کیا کرتے تھے۔ اس سڑک پر نیا نیا تار گھر بن چکا تھا۔ تار گھر کے قریب لاہور کا پہلا بڑا ہسپتال 'میو ہسپتال' کے نام سے کام کرنے لگا تھا۔ لوئر مال پر مغربی تعلیم کے لیے شمالی ہند کا سب سے بڑا کالج 'گورنمنٹ کالج' کے نام سے اشاعتِ تعلیم میں مصروف تھا۔ درحقیقت اس زمانے ہی میں لاہور اشاعتی سرگرمیوں اور اخبار نویسی کے شعبہ کا مرکزی شہر بن چکا تھا۔ اسی شہر میں حالؔی نے ۱۸۷۴ء میں اپنی زندگی کا ایک بڑا تخلیقی تجربہ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں نئی نظمیں پڑھ کر کیا۔

حالؔی نے جس لاہور کو دیکھا تھا وہ کلونیل مظاہر کا منظر نامہ پیش کر رہا تھا۔ صدیوں کی مشرقی تعلیم اور کلاسیکی تخلیقی روایت کے پس منظر میں شہر کے تخلیقی شعور میں جدیدیت کے اولیں رنگ بھی شامل ہوتے جا رہے تھے۔ ۱۸۷۴ء کے تجرباتی مشاعروں سے شہر کے ادبی شعور میں نئے تخلیقی تجربوں کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا جس کا ایک بھرپور تجربہ بعد ازاں اقبال کی نظم ''ہمالہ'' میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ یہ وہ نظم تھی جس میں لاہور کا نیا تخلیقی شعور پہلی بار بولا تھا۔

حالؔی کے عہد کے لاہور نے رڈیارڈ کپلنگ (Rud Yard Kippling) کو بھی دیکھا جب وہ بچہ تھا تو لاہور کی ''زمزمہ'' توپ پہ چڑھ کر کھیلا کرتا تھا۔ بعد ازاں وہ لاہور ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کا ایک صحافی بن گیا تھا۔ مستقبل میں اس نے ادب کا نوبیل پرائز بھی حاصل کیا تھا۔ آج جس مقام پر پینو راما سنٹر ہے وہاں سول اینڈ ملٹری گزٹ کا ایک منزلہ دفتر ہوا کرتا تھا۔ اس عمارت کے بیرونی حصے پر کپلنگ کے نام کی یادگار تختی بھی لگی ہوئی تھی جسے پینو راما سنٹر بناتے وقت ضائع کر دیا گیا۔ نئے مالکان کو یہ کہاں خبر تھی کہ نوبیل انعام حاصل کرنے والے کے بچپن اور جوانی کا کچھ حصہ اسی شہر میں گزرا تھا۔

حالؔی کا عہد شہر کے بھاٹی دروازے سے گھوڑے پر برآمد ہونے والے ایک عالم استاد کو ہر روز دیکھا کرتا تھا جو سر پر پگڑی باندھے اور کالی عبا پہنے ہوئے گورنمنٹ کالج کے گیٹ سے داخل ہوا کرتا تھا۔ گھوڑے سے اترتا تو اپنے ہاتھ میں کتابیں تھام کر برآمدوں میں چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ یہ مولانا محمد حسین آزاد تھے۔

محکمہ تعلیم پنجاب میں پیارے لال آشوب اور مولوی کریم الدین بھی نظر آتے تھے۔ آشوب کی کتاب ''رسومِ ہند'' انیسویں صدی کی مشہور کتاب تھی۔[1] لاہور کے تخلیقی شعور کی ایک مثال مولوی کریم الدین کا ناول ''خطِ تقدیر'' بھی تھا۔ 'خطِ تقدیر' اردو کا پہلا ناول ہے جو اسی شہر میں لکھا گیا تھا اور ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔[2]

اب اس مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے میں حالؔی کی مختصر خودنوشت کا ایک نہایت اہم حصہ آپ کے سامنے پیش کروں گا:

> ''نواب شیفتہ کی وفات (۱۸۶۶ء) کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاہور) میں ایک آسامی مجھ کو مل گئی۔ جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان

کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔'' (۳)

اب میں اس بیان کی اہم باتوں کے نکات کو الگ الگ کر کے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

۱۔ حالی کو ۱۸۷۴ء میں پنجاب بک ڈپو میں ملازمت ملی۔

۲۔ ان کے فرض منصبی میں یہ شامل تھا کہ شعبہ میں انگریزی سے اردو میں جو ترجمے ہوتے تھے۔ حالی ان ترجموں کی عبارتیں درست کرتے تھے۔

۳۔ یہ کام تقریباً چار برس کیا گیا۔

۴۔ ترجمہ کی اصلاح کرنے کے کام کا فائدہ یہ ہوا کہ انگریزی ادب کے ساتھ اچھی طرح مناسبت پیدا ہوگئی۔

۵۔ انگلش سے ہونے والے ترجموں کو پڑھتے پڑھتے آہستہ آہستہ یہ تبدیلی پیدا ہوئی کہ ان کے دل میں فارسی ادب کی وقعت کم ہونے لگی۔

سچ پوچھئے تو یہ بیان بے حد معنی خیز ہے یہ بیان اردو ادب اور حالی کے سلسلے میں ایک بریک تھرو (Break Through) کی حیثیت رکھتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ حالی نے اختصار پسندی سے کام لیتے ہوئے روا روی میں یہ بات کہہ دی ہے کہ پنجاب بک ڈپو میں انھیں انگریزی سے کیے ہوئے اردو تراجم کی اصلاح کرنی پڑتی تھی۔ اصلاح کے اس کام سے ان کے اندر انگریزی ادب کے ساتھ اچھی طرح مناسبت پیدا ہوگئی۔ میں نے یہ کہا ہے کہ حالی نے اپنی ادبی طبع کے مطابق اختصار پسندی اختیار کی ہے۔ حالی ایسے مقامات پر واقعات یا حقائق کو زیادہ وضاحت سے کرنے کے عادی نہ تھے۔ اس طریق کار کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اپنے ترجمے کے کام کے بارے میں وہ بے حد ضروری باتیں نہ کہہ سکے۔ اس مقام پر کاش انھوں نے یہ اطلاعات فراہم کر دی ہوتیں کہ انگریزی ادب کے کن کن فن پاروں کا ترجمہ انھوں نے درست کیا تھا۔ اور ان ترجموں سے انھوں نے کیا کچھ سیکھا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے انگریزی تنقید اور شعری ادب کے ترجمے دیکھے ہوں گے۔ مگر ایسی کسی کاوش کا اقرار ان کے ہاں موجود نہیں ہے۔

یہاں پر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ حالی بک ڈپو میں ترجموں کی اصلاح کا جو کام کرتے تھے کیا اس کی اشاعت بھی کی جاتی تھی؟ یا یہ ترجمے شعبہ کی فائلوں تک محدود رہ جاتے تھے۔ اس کام کے سراغ میں میں نے کافی کاوشیں کی ہیں۔ اس زمانے میں اس قسم کے کاموں کی اشاعت ''رسالۂ انجمن پنجاب'' اور ''اخبار انجمن پنجاب'' میں ہوا کرتی تھی۔ اس قسم کے کئی سو پرچے میری نظروں سے گزرے ہیں۔ ان میں اس قسم کے مواد نشاندہی نہیں ہو سکی ہے۔

یہ لاہور کے تخلیقی شعور ہی کا اثر تھا کہ لاہور کے قیام کے دوران میں ان کی شاعری کی کایا کلپ ہوئی۔ لاہور میں انگریزی ادب سے ان کی مناسب طور پر واقفیت ہوئی۔ اور اس واقفیت سے جو اثرات مرتب ہوئے اور جو نتائج نظر آئے ان کے مطابق حالی نے اپنی پرانی شاعری کو بذاتِ خود قتل کیا۔

حالؔی شعر کی سادگی اور فطرت پسندی کے تصورات کی طرف بھی لاہور ہی میں مائل ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب کے ایک جلسہ میں دیا جانے والا لیکچر بھی ان کے سامنے تھے۔ سادگی اور شاعری کے نیچرل ہونے کا تصور ۱۸۷۴ء میں ان کو ملا تھا۔ مگر یہ تصورات تو پہلے ہی سے ان کے شعری تصور کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں اور ہالرائیڈ کے خیالات نے ان کو مزید تحرک دیا اور ان کی طبع اس سمت میں تیزی سے راغب ہوتی گئی۔ لاہور ہی ان کے شعری تصورات میں تبدیلی کا باعث بنا اور یہ تبدیلی ان کی شاعری کے دوسرے شعری دور کو برباد کر گئی۔ ان کی شاعری کا یہ دوسرا دور تخلیقی طور پر بنجر رہا۔ قومی اصلاح، اخلاقیات اور واقعات وحقائق کی فطرت پسندی ایسے عوامل تھے جو انھیں شاعری کے منصب سے بہت دور کرتے گئے۔ حالؔی شاعری لکھتے رہے مگر اپنے اصلاحی، قومی اور اخلاقیات کے مشن میں غایت درجہ Involvement کے باعث یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ شاعری سے ناشاعری کی منزلوں کا سفر طے کر رہے ہیں۔ اس دور میں ان کے ہاں قدرے اچھی شاعری کے نمونے کہیں کہیں مل تو ضرور جاتے ہیں مگر ان کی شاعری کا مجموعی رنگ و آہنگ معمولی درجے کا ہے۔

۱۸۷۴ء کے بعد حالؔی لاہور سے دلی چلے گئے تھے۔ اسی دور سے وہ غزل کی پرانی روایت سے دست بردار ہو رہے تھے۔ پرانی روایت سے دست برداری کے اس عمل کو ارتداد کا نام دیا گیا ہے۔ اگر یہ ارتداد تھا اور حالؔی ادبی روایت کے مرتد ہوئے تھے۔ تو پھر اس ارتداد کا سرچشمہ لاہور ہی تھا۔ ان کی شاعری، شاعری رہی یا 'ناشاعری' بن گئی یہ سعادت بھی اسی شہر کی عطا تھی۔ حالؔی سے پہلے مشرق کے کلاسیکی ادب کے خلاف آزادؔ نے شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا اور جب حالؔی کو مغربی ادب سے ترجموں کے ذریعے مناسبت پیدا ہوئی تو ان کے خیالات میں تبدیلی کا عمل شروع ہوا۔ کلاسیکی غزل سے جدید غزل کی طرف ان کا سفر اسی ردعمل کی ابتدائی مثال ہے۔

سوال یہ ہے کہ لاہور نے حالؔی کو کیا دیا؟ لاہور شہر نے حالؔی کے ادبی شعور کو مغربی ادب سے بالواسطہ مناسبت اور واقفیت عطا کی۔ ان کے اندر مشرقی ادب کے کم رتبہ ہونے کا احساس پیدا ہوا جس سے فارسی ادب کی وقعت ان کی نظر میں مشتبہ ہوتی چلی گئی۔ میں یہ بات بھی کہتا چلوں کہ حالؔی کی جدید غزل کا ابتدائیہ بھی اسی شہر میں ابھرا تھا۔

اردو غزل کے تصور میں حالؔی نے جس شدت کے ساتھ کلاسیکی غزلیات کی جمالیات، اس کی دیومالا اور اس کی ثقافت کے خلاف ردعمل کا جو مظاہرہ کیا تھا اس سے کلاسیکی غزل کو تو کوئی ضعف نہ پہنچا۔ غزل کی ثقافتی روح کے بنیادی عناصر بدستور غالب رہے مگر حالؔی کی جدید غزل اور اس کی تھیوری ناکام ثابت ہوئی جس سے حالؔی کی شعری شخصیت تحلیل ہو کر رہ گئی۔ ان کی جدید اور قومی شاعری نے قوم کے لیے کچھ کام تو یقیناً کیا۔ انیسویں صدی کے مسلمان ان کے ارشادات سے مستفیض ہوئے مگر ادب کی دنیا میں اس شاعری کی حیثیت ناشاعری والی ہو کے رہ گئی تھی۔ ہمارے قومی شعور میں اب بھی ان کی قومی شاعری کی بازگشتیں سنائی دے جاتی ہیں مگر ہمارے ادبی شعور میں ان کی گونج سنائی نہیں دیتی۔

عالم خوندمیری نے فرانسیسی شاعر آراگان کے حوالے سے ایک بڑی بات کہی ہے کہنا یہ ہے کہ ''کوئی بھی ادیب اس وقت تک ایمان دار ادیب نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ ادب سے بیزار نہ ہو۔ (۱۹۳) اس حوالے سے

اگر دیکھا جائے تو حالؔی اپنے زمانے کا سب سے ایمان دار ادیب تھا۔ اس قسم کی بیزاری کا تجربہ تو آزادؔ کو بھی ہوا تھا مگر وہ اس بیزاری کے حصار میں ایک مختصر مدت کے لیے رہے۔ وہ اس سے کوئی بڑا شعری نقش یا کوئی نیا تنقیدی نظام نہ بنا سکے۔ یہ حالؔی کی ذات تھی کہ جس نے اپنے شعری ماضی کی روایت کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دار پر چڑھا دینے کی جرأت کی تھی۔ ان باتوں کا پس منظر اس تربیت میں تھا جو انھیں لاہور شہر کے پنجاب بک ڈپو میں ملی تھی۔

میں اپنی گفت گو کو سمیٹتے ہوئے یہ بات ایک بار پھر کہوں گا کہ حالؔی کی ادبی شخصیت اور ادبی شعور کی تعمیر میں جو کردار لاہور شہر کے تخلیقی شعور نے ادا کیا تھا اس پر غور و فکر کی ضرورت تھی اور ہم نے اس ضرورت کو ڈیڑھ صدی سے نظر انداز کیے رکھا ہے۔ حالؔی نے اپنی مختصر سی خودنوشت میں پنجاب بک ڈپو کے بارے میں جو بہت مختصر سا بیان درج کیا ہے اس پر کبھی غور نہیں کیا گیا۔ ادبی تاریخ میں اکثر اوقات مورخین کسی بیان کے ظاہری معنوں تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ بیان کے بین السطور کیا معنویت نظر آ رہی ہے اور اس معنویت میں امکانات کے آثار کہاں تک دکھائی دے رہے ہیں۔

حوالے:

(۱) پیارے لال آشوب، **رسومِ ہند**، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء
(۲) مولوی کریم الدین، **خطِ تقدیر**، لاہور: مطبع سرکاری، ۱۹۶۵ء
(۳) شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مرتب؛ **کلیاتِ نثر حالی**، ج-۱، لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۶۷ء، ص۳۳۹